آزادی

طاہر جاوید مغل

مختلف نوعیت کے جرم کا ارتکاب کرنے والے دو مجرموں کا احوال۔ ان کے جرائم ثابت شدہ تھے اور ناقابل معافی۔ انہیں پیش آنے والے حالات میں عجب بے نام سی یکسانیت تھی۔ مقدر کے ان قیدیوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا۔

معاشرت اور حالات کے دو الگ الگ مجرموں کا فسانہ

یہ دو افراد کی دو کہانیاں ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی کہانی ہے۔ یہ کہانی ان دونوں کے ساتھ قریباً قریباً ایک ہی وقت شروع ہوئی اور ایک ہی وقت پر انجام کو پہنچی۔

ان میں سے ایک کا نام قاسم تھا۔ دوسری ایک لڑکی تھی اور اس کا نام راحت تھا۔ قاسم درمیانی عمر کا بال بچے دار شخص تھا اور سرگودھا میں رہتا تھا۔ راحت ایک نوجوان لڑکی تھی اور خوشاب کے ایک دور دراز گاؤں باغ پور کی رہائشی تھی۔

قاسم خوانچہ فروش تھا۔ عورتوں کے بناؤ سنگھار کی سستی اشیا اور منیاری کا دیگر سامان وہ ایک ریڑھی پر رکھ کر گلی گلی بیچتا تھا۔ اس کا بیٹا اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ لاہور جا چکا تھا۔ اب سرگودھا میں قاسم کی بیوی اور بیٹی رہ گئے تھے۔ بیٹی کی عمر بمشکل چودہ پندرہ برس تھی۔ گزر اوقات کے لیے ماں بیٹی مختلف گھروں میں کام کاج کرتی تھیں۔

خوانچہ فروش قاسم کے پاس عرصے سے پچاس روپے والے چند انعامی بانڈ پڑے تھے۔ ایک روز قاسم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ اس کے ایک بانڈ پر پندرہ ہزار روپے کا انعام نکل آیا ہے۔ جب انعام کی اچھی طرح تصدیق ہو گئی تو قاسم کو بانڈ بھنانے کی فکر لاحق ہوئی۔ اپنے بیٹے سے بڑھ کر وہ کس پر اعتبار کر سکتا تھا، وہ سیدھا لاہور گیا۔ بیٹا اور بہو بھی بہت خوش ہوئے۔ بیٹے نے بانڈ کیش کرالیا لیکن بینک میں جانے کے بجائے باہر سے رقم لے لی۔ قاسم کا خیال تھا کہ وہ تین چار ہزار روپے بیٹے کو دے گا اور باقی سرگودھا لے جائے گا۔ اگر رقم محفوظ رہتی تو کل کلاں بیٹی کے بیاہ میں کام آتی لیکن جب اسے پتا چلا کہ بہو امید سے ہے تو اس کی مٹھی اور بھی "ڈھیلی" ہو گئی۔ ایک ننھے منے ہمکتے ہوئے پوتے کے تصور نے اسے اتنا نہال کیا کہ اس نے خاموشی سے نصف رقم بیٹے کے ہاتھ میں تھمادی۔ لاہور سے سرگودھا واپس جاتے ہوئے اسے اپنے خوانچے کے لیے کچھ سامان بھی لینا تھا۔ سامان وغیرہ لے کر وہ تیسرے چوتھے روز لاہور سے واپس سرگودھا روانہ ہو گیا۔

وہ مارچ کی ایک بڑی سہانی شام تھی۔ ہر طرف پھول کھلے تھے۔ فضا میں خوشبو کا بسیرا تھا لیکن حالات کا ایک اپنا موسم ہوتا ہے۔ اس خوشبو بھری شام کو قاسم سے ایک "جرم" سرزد ہو گیا۔ ٹرین سرگودھا کے اسٹیشن پر پہنچی۔ قاسم اپنے سامان والے بیگ کے ساتھ نیچے اترا۔ خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے سامان والا بیگ ایک ستون کے ساتھ رکھا اور مردانہ انتظار گاہ کی طرف بڑھا۔ یہاں پانی کا ایک خستہ حال کولر موجود تھا۔ قاسم نے پانی کی ٹونٹی کی طرف سر جھکایا ہی تھا کہ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ تیزی سے پھیلتے ہوئے دھوئیں میں قاسم نے دیکھا کہ کئی لوگ فرش پر گرے پڑے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پھر قاسم کا دھیان اپنے قدموں کی طرف گیا۔ اسے ایک کٹا ہوا خون آلود انسانی ہاتھ نظر آیا۔ قاسم ہذیانی انداز میں چلایا اور مڑ کر بھاگا۔ وہ ابھی اسٹیشن کے بیرونی برآمدے میں ہی پہنچا تھا کہ کسی نے عقب سے اسے دبوچ لیا۔ یہ ایک باوردی پولیس اہلکار تھا۔

قریباً یہی وقت تھا جب سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن سے بہت دور خوشاب کے اس دور دراز گاؤں ابانی پور میں راحت نامی لڑکی کی کہانی شروع ہوئی۔ راحت سے بھی ایک "جرم" سرزد ہوا۔ راحت ایک غریب مزارع غلام حسین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے دو بھائی اس سے کافی چھوٹے تھے اور گاؤں کے چھوٹے سے اسکول میں پڑھتے تھے۔ راحت خوب صورت تھی، وہ ہنستی تھی تو اس کے دنداسے کا رنگ نمایاں ہوتا تھا اور دانت موتیوں کی طرح دمکتے تھے۔۔۔ وہ بہار کا موسم تھا۔ بڑی سہانی شام تھی۔ فضا میں خوشبو کا راج تھا۔ گندم کے سنہری کھیت کے ساتھ ساتھ چلتی جب وہ کنوئیں کی طرف جا رہی تھی، اس کی نگاہ ماسٹر ارشاد کے بیٹے تنویر پر پڑی۔ تنویر اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ شروع سے ہی اسے اچھا لگا کرتا تھا۔ وہ کئی برس پہلے اپنے ماموں کے پاس کراچی چلا گیا تھا اور وہاں پڑھتا رہا تھا۔ اس کی واپسی چند روز پہلے ہی ہوئی تھی۔ اب وہ یہاں گاؤں میں بڑے بچوں کے لیے بڑا اسکول کھولنے کی باتیں کر رہا تھا۔ راحت نے تنویر کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے میں کوئی شے ایک دم پگھل گئی ہے اور اس کا دل بالکل مختلف انداز سے دھڑکنے لگا ہے۔ گئے وقت میں وہ دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کا نام لے کر بلایا کرتے تھے لیکن اب کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ ایکا ایکی کوئی تبدیلی آگئی تھی۔ راحت تنگ پگڈنڈی پر اپنا بدن چرا کر تنویر کے قریب سے گزرنا چاہتی تھی لیکن نہ گزر سکی، وہ دونوں ہولے سے ٹکرا گئے اور یہ مختصر لمس ان دونوں کے لیے یادگار بن گیا۔

جس طرح کسی نامعلوم شخص نے قاسم کی بے خبری میں اس کے بیگ میں بم رکھا تھا اور وہ بے گناہ تھا اسی طرح راحت بھی بے گناہ تھی۔ اس کے سینے میں جس "جذبے" کا آتش فشاں پھٹا تھا وہ "جذبہ" اس نے خود تو اپنے دل میں نہیں چھپایا تھا، یہ دستِ قدرت کا کام تھا۔ وہی دستِ قدرت جس کی انگلیوں سے بندھی ہوئی ڈوریاں ہمیں کٹھ پتلیوں کی طرح چلاتی ہیں۔ سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر قاسم ناکردہ جرم کی پاداش میں پکڑا گیا۔ باغ پور کی راحت بھی ناکردہ جرم کی پاداش میں "گرفت" کی راہ پر چل پڑی۔۔۔ پگڈنڈی پر ہونے والی اس پہلی ملاقات کے تین ہی ہفتے بعد جب وہ آموں کے باغ میں تنویر سے باتیں کر رہی تھی، ایک آہٹ نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ تنویر نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا سر راحت کی آغوش سے نکالا۔ راحت نے جلدی سے سینے پر اوڑھنی پھیلائی۔ سامنے درختوں میں جنبش ہوئی اور چوہدری

ہو وہاں کا ایک کاریگر وہ ان پر ڈھائی لاکھ لے کے بعد دونوں ہاتھوں میں او جھل ہو گیا۔

○☆○

قاسم پر عدالت میں ثابت ہوا۔ سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ جس جرم کی وجہ سے تین افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے وہ قاسم کے بینک میں تھا۔ قاسم کو موقع سے فرار ہوتے ہوئے ایک درجن پولیس اہلکار نے دبوچا تھا۔ پھر قاسم کے پاس سے سات ہزار روپے کی خطیر رقم بھی برآمد ہوئی تھی۔ یہ رقم قاسم جیسے خوانچہ فروش کے پاس کہاں سے آئی۔ وکیل صفائی اس سوال کا کوئی "ایسا موثر" جواب نہ دے سکا جس کی قانونی حیثیت ہوتی۔ وہ بانڈ جس پر قاسم کا انعام نکلا تھا اس کے بیٹے نے بینک سے بالا ہی بالا فروخت کروا دیا تھا۔ قاسم کے اڑوس پڑوس میں بھی کسی کو بھنک تک نہیں تھی کہ قاسم کا بانڈ نکلا ہے۔ اس حوالے سے وکیل صفائی نے جو چند کمزور دلیلیں پیش کیں، وکیل استغاثہ نے ان کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ شومیٔ قسمت ایک دو مزید باتیں بھی سراسر قاسم کے خلاف گئیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اس سے پہلے بھی جیل کاٹ چکا تھا۔ یہ گلی محلے میں ہونے والے ایک پرانے جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ اس جھگڑے کے نتیجے میں ایک بااثر شخص نے قاسم پر چوری کا پرچہ درج کرایا تھا اور جرمِ بے گناہی میں اسے چھ ماہ قید بھگتنا پڑی تھی۔

جس دن عدالت میں بے قصور قاسم پر جرح ہو رہی تھی، اسی دن باغ پور کی پنچائت میں بے قصور راحت بھی مجرموں کے کٹہرے میں تھی۔ جاگیردار تیمور زماں مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور قہر آلود نظروں سے راحت کے باپ خادم حسین اور چچا مروّت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں مزارعے تھے اور ہمیشہ سر جھکا کر رکھتے تھے لیکن آج تو ان کے سر اتنے جھکے ہوئے تھے کہ ٹھوڑیاں سینے سے جا لگی تھیں اور کیوں نہ لگتیں، ان کی بیٹی سے ایک ناقابلِ معافی جرم ہوا تھا۔ اس نے پیار کیا تھا۔ جاگیرداروں کی "اجازت" کے بغیر پیار کیا تھا۔ اور پیار بھی اس نوجوان سے جو جاگیردار اور اس کے حواریوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ وہ یہاں نیا اسکول بنانا چاہ رہا تھا۔ ایسا اسکول جس میں گاؤں کی لڑکیاں اور لڑکے دسویں تک پڑھ سکیں۔ یہ کتنی بڑی بغاوت، کتنی بڑی سازش تھی۔ جاگیردار تیمور اور اس کے اثر و رسوخ کے خلاف؟ ان لوگوں کے بس میں ہوتا تو تنویر کو کچا چبا جاتے۔ انہوں نے اسے کچا تو نہیں چبایا تھا لیکن اتنا مارا تھا کہ وہ کئی ہفتوں تک بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب جاگیردار کو یقین تھا کہ وہ بستر سے اٹھ بھی گیا تو اپنی نظروں

خوبی کی تلاش

ایک حسین لڑکی اہلِ محفل کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا "مجھے تو اس لڑکی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی مگر جانے کیوں لوگ اسے گھیرے کھڑے ہیں۔"

شوہر نے معصومیت سے کہا "خوبی تو مجھے بھی کوئی نظر نہیں آئی۔ قریب جا کر دیکھتا ہوں، شاید نظر آ جائے۔"

محمد جہانزیب افضل کی پیشکش، پھیلیانوالہ سے

سے نہیں اٹھ سکے گا۔ اور جب وہ اپنی نظروں سے نہیں اٹھ سکے گا تو اسکول کی دیواریں کیسے اٹھائے گا۔۔۔۔ باغ پور کی اس پنچائت میں راحت کی ماں بھی موجود تھی۔ بیٹی کی طرح اس نے بھی اپنا سراپا چادر میں چھپا رکھا تھا۔ چادر کی لرزش گواہ تھی کہ ماں بیٹی خشک پتے کی طرح لرز رہی ہیں۔ جاگیردار چنگھاڑ رہا تھا اور اس کی آواز کمزور لوگوں کے کلیجے شق کر رہی تھی۔ کافی دیر گرجنے برسنے کے بعد اس کا لہجہ کچھ نارمل ہوا، اس نے کہا "ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ مزارعے خادم حسین کی لڑکی کے سبب پورے گاؤں کی آبرو پر حرف آیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسے دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بنایا جاتا لیکن چونکہ اس کے باپ اور چچا نے دست بستہ معافی مانگی ہے اور گاؤں والوں سے بھی شرمندہ ہوئے ہیں لہٰذا اس لڑکی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ چونکہ خادم اور مروّت نے بتایا ہے کہ فی الحال ان کی نظر میں لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ہے اس لیے پنچائت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈا جائے اور اس کے دو بول پڑھوا دیے جائیں۔"

○☆○

سیشن کورٹ میں قاسم کو سزائے موت سنا دی گئی اور دوسری طرف باغ پور کی پنچائت نے خوبرو راحت کو "شادی بالجبر" کی سزا سنا دی۔

قاسم کے خستہ حال والی وارثوں نے جیسے تیسے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔۔۔۔ دوسری طرف راحت کا والد خادم حسین بھی ایک روز روتا دھوتا علاقے کے ایم این اے کی حویلی میں جا پہنچا۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں تھی اور آنسو دھاروں کی صورت جھریوں بھرے رخساروں پر بہہ

رہے تھے۔ ایم این اے شہاب دارا کے سامنے پہنچ کر وہ سرتاپا لرزنے لگا۔ "مائی باپ! میری مدد کریں۔ میری بچی کو بے موت مرنے سے بچائیں۔"

"جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔" شہاب دارا کے سیکریٹری نے کہا۔ "اگر دارا صاحب تمہاری مدد کرسکے تو گریز نہیں کریں گے۔"

خادم کی ہچکی بندھ گئی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ "دیکھو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" شہاب دارا نے کہا۔ "اگر تمہارا رونا بہت ضروری ہے تو پہلے باہر جاکر بوجھ ہلکا کرلو۔"

خادم حسین کا رونا بند ہوگیا۔ رونا تو اس وقت آتا ہے جب حرفِ تسلی کان میں پڑے۔ جب کوئی ہمدردی سے شانہ سہلائے۔ جب رونے والے کو جھڑکا جائے تو آنسو رخساروں کے بجائے دل پر گرنا شروع ہوجاتے ہیں۔ خادم حسین خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا "دارا صاحب! میری بچی سے غلطی ضرور ہوئی تھی لیکن اس کی اتنی کڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے تھی۔۔۔ جاگیردار جی میری بچی کا رشتہ ایک تیس سالہ رنڈوے سے کررہے ہیں۔ وہ کسی طرح بھی میری پھول سی بچی کے قابل نہیں لیکن وہ۔۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"لیکن وہ جاگیردار جی کا خاص بندہ ہے اس لیے ہم میں دم مارنے کی جرأت نہیں۔ اگر۔۔۔۔ اگر ہم نے اشارہ بھی دیا کہ ہمیں یہ رشتہ پسند نہیں تو جاگیردار جی ہم پر بڑی سختی کریں گے۔"

"پنچایت کیا کہتی ہے؟"

"پنچایت تو وہی کہے گی مائی باپ جو جاگیردار جی کہیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ رنڈوے سے میری بیٹی کا رشتہ پنچایت کا نہیں جاگیردار جی کا فیصلہ ہے۔"

شہاب دارا نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں "تم نے بیٹی کے لیے خود کوئی رشتہ کیوں نہ ڈھونڈا؟"

"پنچایت نے جی ایک ہفتے کی شرط لگائی تھی۔ اتنی جلدی رشتہ کہاں سے ملتا ہے جی!"

"یہی تو بات ہے بے وقوف! جن لڑکیوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نکل جاتی ہیں ان کا بر ملنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر تو کسی طرح گناہ کی گٹھڑی کو سر سے اتارنا ہوتا ہے۔"

"میری بچی نے کچھ نہیں کیا مائی باپ! وہ بالکل معصوم ہے۔ بالکل پاک ہے۔ اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیے اسے۔ آپ ہمیں بس جاگیردار جی سے تھوڑی سی مہلت لے دیں۔ ہم جاگیردار جی کا قرضہ اتار کر یہاں سے چلے جائیں گے یا پھر۔۔۔ بچی کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈلیں گے۔ ایک دو مہینے کی مہلت تو مل جائے ہمیں۔"

خادم پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ شہاب دارا کے چہرے پر ترس کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا "حوصلہ کر بھئی! میں کچھ دن کے لیے شہر جارہا ہوں۔ واپس آکر اس معاملے کو دیکھوں گا۔ اس دوران میں تم بھی سوچنے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"ہم نے کیا سوچنا سمجھنا ہے مائی باپ! ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں جی!" خادم نے شہاب دارا کے پاؤں چھوئے اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔

○☆○

قاسم کی اپیل ہائی کورٹ سے خارج ہوگئی۔ عدالت نے ٹھوس شواہد کی بنا پر اس کی سزائے موت بحال رکھی تھی۔ جس روز اپیل خارج ہوئی، قاسم خوب رویا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ ہونے والے پوتے کا منہ چومنا چاہتا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ چاہتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں جن کا انتظار اس کے خون میں رچا بسا تھا لیکن اب یہ سب کچھ اس سے چھن رہا تھا۔۔۔۔ اسے بے اختیار رونا آیا۔ اب رخصتی کے وقت اس کی رانو بیٹی کس کے کندھے پر سر رکھ کے روئے گی۔ اب اس کا پوتا اپنی توتلی زبان میں کس کو دادا کہے گا۔ اور پھر رانو کی ماں، اس تھکی ماندی بیمار عورت کا خیال کون رکھے گا۔ کون راتوں کو اس کے ساتھ مل کر کھانسے گا اور اس کے دکھ درد سنے گا؟

دوسری طرف ایم این اے شہاب دارا کی "عدالت" سے نوجوان مجرمہ راحت کی "اپیل" بھی خارج ہوگئی تھی۔ ایک روز شہاب دارا اپنی جیپ پر باغ پور آیا تھا۔ ایم این اے اور جاگیردار نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔ شکار کھیلا تھا، گھڑ سواری کی تھی اور پتا نہیں کیا کچھ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ ان مصروفیات کے دوران میں چند لمحے کے لیے خادم حسین اور اس کی بے گناہ بیٹی کے بارے میں بھی بات ہوئی ہو لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ خادم حسین کو امید تھی کہ ایم این اے کی موجودگی میں اسے بھی حویلی بلایا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ غالباً جاگیردار نے ہونے ہی نہیں دیا۔ ایم این اے دارا صاحب اسے ملے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ اسی رات جاگیردار زمان نے خادم حسین کو حویلی میں بلایا تھا۔ جاگیردار کی خوں بار آنکھیں دیکھ کر خادم حسین کا خون خشک

ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر جاگیردار کی دہاڑوں نے پوری کر دی تھی۔ اس نے خادم حسین کو بری طرح لتاڑا پھٹکارا تھا۔ بس اتنی رعایت کی تھی کہ خادم کو اپنے جلاد صفت کارندوں سے پٹوایا نہیں تھا۔ شاید ایم این اے دارا صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے یہ رعایت کی گئی تھی۔

خادم حسین کی اس یادگار بے عزتی کے موقع پر اس کا ہونے والا داماد "مولی" بھی موجود تھا۔ وہی پختہ عمر اور پختہ رنگ کا شخص جس کے موٹے بھدے ہونٹوں پر لفنگی سی مسکراہٹ رہتی تھی اور جو جاگیردار کے اردگرد "جی سرکار، جی سرکار!" کرتا پھرتا تھا۔ یہ شخص جیل خانہ جات کے محکمے میں ادنیٰ سا ملازم تھا۔

جاگیردار نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا "تم لوگ ہو ہی اس قابل کہ تمہیں جوتے کی نوک پر رکھا جائے۔ تیرے لیے اگر میرے دل میں تھوڑی بہت نرمی تھی بھی تو اب وہ ختم ہو گئی ہے۔ اب تیری بیٹی کا بیاہ مولی سے ہو گا اور ضرور ہو گا۔ تو جانتا ہے کہ پنچائت کے سامنے بات پکی ہو چکی ہے۔ ایک دو ماہ کے اندر تو بیاہ کی تیاری کر لے۔ مولی کے گھر والے اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

○☆○
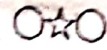
پھر ایک روز میانوالی جیل میں قاسم کو کوٹھی لگ گیا تھا۔ وہی کوٹھی جس میں صرف ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ پھانسی گھاٹ کی طرف کھلتا تھا۔

بالکل اسی انداز میں راحت بھی "کوٹھی" لگ گئی تھی۔ بے شک اس کی کوٹھی مختلف تھی لیکن صورتِ حال تو یہی تھی۔ اسے "مایوں" بٹھا دیا گیا تھا۔ اس رسم کے مطابق راحت اب تنہا کہیں آ جا نہیں سکتی تھی۔ دو تین سہیلیاں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں بھی نگرانی کرتی تھیں۔ اگر قاسم کی کوٹھری سے باہر سرخ ٹوپیوں والے پہرے دار تھے تو راحت کے گھر سے باہر جاگیردار کے سرخ پگڑیوں والے کارندے تھے۔ وہ راحت کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ کتنی مطابقت تھی دونوں کہانیوں میں۔

قیدی قاسم کے گھر والوں کی طرح قیدی راحت کے گھر والوں کو بھی رو دھو کر سکون آ گیا تھا اور وہ بیاہ کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ لیکن جس طرح قاسم کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی اسی طرح راحت کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ سزائے موت کے قیدی کو چین آئے بھی تو کیسے؟ وہ رات کو کمرے کی دیوار سے ٹیک لگاتی اور کربناک سوچیں اسے گھیر لیتیں۔ وہ اپنے بچپن کے پیار تنویر کے بارے میں سوچتی۔ کتنے برس گزر گئے تھے جب سے وہ دونوں ایک دوسرے کے دل میں سمائے ہوئے تھے۔ ایک ایک بات، ایک ایک ملاقات اسے یاد آتی۔ بیت جانے والے سہانے موسم، گزر جانے والے رنگین تہوار، میلے ٹھیلے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ بھولنے والی یادوں کی پرچھائیاں۔ وہ ایک ایک یاد کو سیکڑوں مرتبہ دہراتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ بچپن سے لے کر جوانی تک تنویر اور وہ ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہے۔ جو عرصہ انہوں نے دور رہ کر گزارا ہے اس عرصے میں بھی وہ محبت کے سفر میں آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اب ــــ جو ساری عمر کا شناسا تھا وہ اس کے لیے اجنبی بننے والا تھا اور جو اجنبی تھا وہ اتنا قریب آنے والا تھا کہ ہر فاصلہ مٹنے والا تھا۔ مولی کا چہرہ تصور میں آتے ہی اسے گھن آنے لگتی۔ راہ چلتے اور گاؤں کی گلیوں سے گزرتے اس نے کئی بار مولی کو دیکھا تھا۔ وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا لیکن ہر وقت جاگیردار کی بیٹھک میں گھسا رہتا تھا۔ راحت نے کسی سے یہ بھی سنا تھا کہ وہ عیسائی سے مسلمان ہوا ہے۔ وہ جیل خانے میں ملازم تھا۔ کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ کیا کام کرتا ہے۔ ایک سہیلی نے راحت کو بتایا تھا کہ چپراسی وغیرہ ہے۔

راحت نے جب بھی مولی کو دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں شکرے کی سی چمک نظر آئی تھی۔ ایک گرسنہ بھوکی چمک۔ راحت کو یوں لگتا تھا جیسے یہ نظر ایک تیز چونچ کی طرح اس کے جسم میں پیوست ہو رہی ہے۔ اسے چیر پھاڑ دینا چاہتی ہے۔ وہ گھبرا کر خشک نظروں سے مولی کی طرف دیکھتی۔ ایسے میں اس کے بھدے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ بکھر جاتی۔ جاگیردار نے جب سے راحت کو مولی سے منسوب کیا تھا، مولی کے ہونٹوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ کچھ اور بھی مکروہ ہو گئی تھی۔ وہ کہتا کچھ نہیں تھا بس راحت کی طرف دیکھا کرتا تھا، بالکل کسی گوشت خور پرندے کی طرح۔

ــــ میانوالی جیل کی کہانی میں قاسم رات بھر جاگتا تھا۔ وہ اپنی طرف بڑھنے والی موت کی چاپ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے عزیز اسے بچانے کے لیے آخری کوششیں کر رہے تھے۔ رحم کی اپیلیں دائر کی جا رہی تھیں اور خاندان والوں سے چندے اکٹھے کر کے وکیلوں کی جیبیں گرم کی جا رہی تھیں۔

باغ پور کی کہانی میں راحت کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ تھا۔ اس کی والدہ اور چچا بدستور کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ سرگودھا کا ایک بڑا مشہور ڈاکٹر تھا۔ وہ دو تین بار جاگیردار تیمور زماں کا علاج کر چکا تھا۔ جاگیردار اسے بہت مانتا

تھی۔ ایک دوبار ڈاکٹر اس کے کہنے پر سرگودھا سے باغ پور بھی آیا تھا۔ کسی نے راحت کے چچا اور والدہ کو یہ بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ اس ڈاکٹر کے پاس پہنچے تھے۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہردلعزیز سماجی کارکن بھی تھا۔ اس نے راحت کی والدہ اور چچا کو سمجھایا تھا کہ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ جاگیردار جی کے مقروض ہیں۔ اس قرض کی وجہ سے وہ جاگیر چھوڑ کر نہیں جاسکتے اور نہ ہی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں جاگیردار جی کے منشا کو ٹھکرا سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے مناسب ترین راستہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کوشش کرکے جاگیردار جی کا قرض اتار دیں۔ اس کے بعد جاگیردار جی سے رشتے کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کی جائے۔ ڈاکٹر ریاض نے انہیں یقین دلایا کہ وہ جاگیردار جی کو فیصلہ بدلنے پر رضامند کرلے گا۔

ڈاکٹر کی یقین دہانی راحت کے چچا اور والدہ کے لیے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" ثابت ہوئی۔ انہوں نے عزیزو اقارب سے رجوع کیا۔ منت سماجت کرکے جس سے جتنی رقم مل سکی، حاصل کی، گھر کی چیزیں بیچیں، جو دو چار گہنے تھے وہ بیچے اور کسی نہ کسی طرح مطلوبہ رقم جمع کرکے جاگیردار تیمور زماں کو پیش کردی۔

○☆○

خوانچہ فروش قاسم کے لیے کی جانے والی کوششیں ناکام ہوگئیں اور اس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہوگئی۔

... دوسری طرف سماج کی جیل میں بے رحم رواجوں کی کوٹھری میں بند راحت کے لیے کی جانے والی تمام کوششیں بھی ناکام ہوگئیں۔ حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ اپنا قرض وصول کرنے کے باوجود جاگیردار جی کے رویّے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جاگیردار کے منشی نے لمبا چوڑا ہی کھاتہ خادم حسین اور ڈاکٹر ریاض کے سامنے کھول دیا تھا۔ اس کھاتے کے مطابق اصل زر کے برابر ہی سود بھی خادم حسین پر چڑھ چکا تھا۔ یعنی قرض ادا ہونے کے بعد بھی جوں کا توں تھا۔ ڈاکٹر ریاض کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی تھی بلکہ جاگیردار نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ قرض کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ یہ زبان کا معاملہ ہے۔ خادم حسین نے گاؤں والوں کے سامنے زبان دی ہے۔ قرض ادا ہو یا نہ ہو، خادم حسین کو بیٹی کا رشتہ مولی کو دینا ہی ہوگا۔

یہ آخری آس ٹوٹنے کی اطلاع راحت کو اس کی ایک سہیلی نے دی۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "راحتے! شاید تیرا مقدر ہی خراب ہے۔ تیری ماں اور تیرے چچا نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے لیکن وہ تیرے لیے کچھ نہیں کرسکے۔ جاگیردار نے کہا ہے، تیری شادی مولی سے ہی ہوگی۔ یہ قرض کا معاملہ نہیں ہے، یہ قول ہارنے کی بات ہے۔"

راحت بڑی دیر گم صم بیٹھی رہی، پھر کراہتے ہوئے بولی۔ "ثریا! کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ کچھ کھا کر سوجاؤں۔"

"نہ میری جان ایسا مت سوچنا" ثریا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ماں باپ کے لیے اس سے بڑا طعنہ اور کوئی نہیں ہوتا۔"

بے بسی کے آنسو راحت کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

...جس دن میانوالی جیل میں قاسم کا بلیک وارنٹ جاری ہوا اسی دن شام کو راحت کی سسرال سے اس کی شادی کا کارڈ چھپ کر آیا۔ جس روز جیل کی کال کوٹھری میں قاسم کی اپنے عزیزوں سے آخری ملاقات ہوئی، اسی رات راحت نے بھی گھر کے پچھلے صحن میں چوری چھپے اپنے بچپن کے پیار سے آخری ملاقات کی۔

میانوالی جیل میں قاسم رو رہا تھا اور اس کے عزیز رو رہے تھے۔

خادم حسین کے گھر کے پچھلے صحن میں راحت رو رہی تھی اور تنویر رو رہا تھا۔

یہ آخری باتیں تھیں..... یہ آخری لمس تھا۔

یہ آخری باتیں تھیں..... یہ آخری لمس تھا۔

"میری رانو کا خیال رکھنا۔ میرے پوتے کو میرا پیار دینا۔ میری لاش پر واویلا نہ کرنا" قاسم اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بھول جانا۔ میرے خط جلا دینا۔ شہر جاکر ایک نئی زندگی شروع کرنا" راحت اپنے محبوب سے کہہ رہی تھی۔

قاسم نے اپنے پیاروں سے اپنے کہے سنے کی معافی مانگی۔

راحت نے اپنے محبوب سے اپنے کہے سنے کی معافی مانگی۔

آخری ہچکیاں، آخری آنسو اور آخری بوسے..... ایک دل ہلا دینے والے شور کی گونج میں آخری ملاقات ختم ہوگئی۔

میانوالی جیل کی کوٹھری میں وہ کرب کی رات تھی۔

خادم حسین کے گھر میں بھی وہ کرب کی رات تھی۔

قاسم جاگتا رہا اور اس کے اردگرد موجود لوگ جاگتے رہے۔

راحت جاگتی رہی اور اس کے اردگرد موجود لوگ جاگتے رہے۔

بہت کوشش کی گئی لیکن قاسم نے کچھ نہیں کھایا۔ دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس ایک کونے میں پڑا رہا۔

بہت کوشش کی گئی لیکن راحت نے کچھ نہیں کھایا۔ دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس ایک کونے میں پڑا رہا۔

قاسم نیم جان سا چٹائی پر لیٹا رہا اور کچھ آیات پڑھتا رہا۔

راحت بھی نڈھال سی ایک چارپائی پر پڑی رہی اور اس کے منہ سے رہ رہ کر "ہائے اللہ" کی صدا نکلتی رہی۔

اس کے بعد بھی دونوں افراد کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک ہوا۔

قاسم کو علی الصباح نہانے کے لیے نیم گرم پانی دیا گیا تھا۔

راحت نے بھی اس صبح نیم گرم پانی سے غسل کیا۔

قاسم نے سیاہ جوڑا پہنا تھا۔

راحت نے سرخ جوڑا پہنا۔

سیاہ جوڑا پہن کر قاسم یکایک بے دم سا ہو گیا۔ اس کا دل "سانولے سینے" میں برف کا گولا بنتا جا رہا تھا۔ دہشت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

سرخ جوڑا پہن کر راحت بھی ایک دم نیم جان سی ہو گئی تھی۔ اس "نازک بدن" کو محسوس ہوا تھا کہ خون اس کی رگوں میں جمنے لگا ہے۔ دہشت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

جیل کے حکام' وارڈن' مقدم' سنتری' ڈاکٹر' مجسٹریٹ ایک برات کی طرح قاسم کو لینے آئے تھے۔ وہ بڑے زبردست لوگ تھے۔ وہ اسے لیے بغیر جانے والے نہیں تھے۔ یہ ویسی ہی برات تھی جیسی چند گھنٹے بعد باغ پور گاؤں میں خادم حسین کے گھر اترنے والی تھی۔

جیل کے حکام کوٹھری کے اندر پہنچے۔ سیاہ پوش قاسم چٹائی پر نیم دراز تھا۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی کے سبب اس کا چہرہ کچھ اور بھی دبلا پتلا نظر آنے لگا تھا۔ ایک آفیسر نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا معائنہ کیا۔ دل کی دھڑکن بے حد کمزور تھی اور ہر دھڑکن کے ساتھ ایک دو غیر ضروری آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ شاید ہارٹ اٹیک کی سی کیفیت تھی۔ سرکاری ڈاکٹر درجنوں بار ایسے مراحل سے گزر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا ان اعصاب شکن لمحات میں اکثر قیدیوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اگر "میڈیکل ٹریٹ منٹ" کے چکروں میں پڑا جائے تو سارا شیڈول درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر میڈیکل ٹریٹ منٹ کا فائدہ؟ جس پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہو اس پر جراثیم کش دوا کے اسپرے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا "اسٹریچر پر لے جانا ہو گا۔"

مجسٹریٹ نے محتاط لہجے میں کہا "دیکھ لیں فزیکل کنڈیشن کیا ہے؟"

"غیر معمولی بات نہیں۔ بے ہوشی ہے۔ میں انجکشن دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے سنبھل جائے گا۔"

اس نے موت کے مسافر کو انجکشن دیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسانے لگا۔ اسے اسٹریچر پر ڈالا گیا اور پھانسی گھاٹ پہنچا دیا گیا۔ رات کے اندھیرے میں "دن" کے اجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ "دن" جو قاسم کو کبھی نہیں دیکھنا تھا۔ پھانسی گھاٹ کے اردگرد کچھ سائے متحرک تھے۔ ان میں جلاد مولا بخش بھی تھا۔ وہ پوری طرح تیار تھا۔

پھانسی گھاٹ پر قاسم کا ایک بار پھر معائنہ کیا گیا۔ اس کی حالت غیر تھی لیکن لمبے بکھیڑوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہوتا ہے کہ سزا پر عمل درآمد ہو جائے۔ سب کی جان چھوٹ جاتی ہے اور مجرم کی بھی۔ قاسم کو سہارا دے کر اٹھایا گیا۔ اسے ایک زندہ میت کا احترام دیا جا رہا تھا۔ دو توانا پہرے داروں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دیے' اس کی ٹانگیں زمین پر نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ پینتالیس سال کا تھا' چوالیس سال تک جو پاؤں اس کا بوجھ اٹھاتے رہے تھے' وہ اب بوجھ اٹھانے سے انکاری تھے۔ اگر کہا جائے کہ قاسم کو اٹھا کر تختۂ دار تک پہنچایا گیا تو غلط نہ ہو گا۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں پھر ایک دم اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ سانس جھٹکے سے آنے لگی۔ جسم میں خفیف لرزش نمودار ہو گئی۔ پھندا "جلاد مولا بخش" کے ہاتھ میں تھا۔ باوردی اہلکار مجرم کو سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھوں میں توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ یکایک ڈاکٹر کو اندازہ ہوا کہ مجرم کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا ہے۔ اس نے اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بہ آہستگی مجرم کو تختۂ دار پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے بڑے دھیان سے مجرم کا معائنہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھ کر بولا "ہی از نو مور۔"

○☆○

جلاد مولا بخش کافی عرصے سے یہ کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اسی قسم کے دو تین واقعات ہو چکے تھے۔ پھانسی پانے سے پہلے ہی مجرم بے جان ہو گیا تھا۔ لہٰذا اسے آج والے واقعے پر زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ ویسے بھی آج اس کے پاس حیران ہونے کے لیے فالتو وقت نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد گھر واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ پھانسی گھاٹ سے وہ جیلر صاحب کے

تیار۔ وہاں ضروری تیار کروا کر وہ سات بجے کے لگ
بھگ تیار ہو گیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور آٹھ بجے
والی بس پکڑ کر میانوالی سے خوشاب روانہ ہو گیا۔ وہ بڑبڑا رہا
تھا "یہ نوکری بھی بری بلا ہے۔ نادر شاہی حکم آتا ہے اور کسی
بھی وقت حاضر ہو جانا پڑتا ہے....." آج اس کا بیاہ تھا اور آج
ہی اسے سب کچھ چھوڑ کر میانوالی آنا پڑ گیا تھا۔ مولا بخش
عرف مولی باغ پور کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ
باغ پور کے جاگیردار تیمور زماں کا چہیتا کارندہ تھا۔ آج
مزارعے خادم حسین کی بیٹی سے اس کا بیاہ تھا۔

میانوالی جیل کے قیدی "قاسم" اور باغ پور گاؤں کی
قیدی "راحت" کی کہانی بالکل ایک جیسی تھی لیکن ان کے
واقعات، مقامات اور کردار مختلف تھے..... سوائے ایک
کردار کے..... اور وہ کردار جلاد مولا بخش عرف مولی کا تھا۔
مولی جو دہشت، سنگدلی اور موت کی علامت تھا۔ اسے خود
بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دو ایک جیسی کہانیوں کا ایک مشترک
کردار ہے۔

خادم حسین کے گھر راحت کی برات باجے گاجے کے
ساتھ آئی۔ جاگیردار کے کارندوں نے ہوائی فائرنگ کی،
پٹاخے چھوڑے اور ہیجڑوں کا رقص دیکھا۔ دلہن سرخ
جوڑے میں لپٹی کمرے میں بیٹھی تھی..... لیکن بیٹھی نہیں
تھی..... وہ نیم دراز تھی۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد
تھا۔ سانسیں بے ترتیب تھیں۔

"اٹھو بیٹی، اٹھو" ماں نے اس کی کمر کے نیچے ہاتھ گھسیڑا۔
"پرسوں سے بھوکی ہو۔ تھوڑا سا کھا لو، بس دو تین لقمے۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

اس نے زہر نہیں کھایا تھا۔ اس فاختہ جیسی لڑکی میں
اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ زہر کھاتی۔ وہ اتنے بڑے قدم کے
بارے میں سوچ سکتی تھی، یہ قدم اٹھا نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ
صبح سے کھینچ کھینچ کر سانسیں لے رہی تھی۔ بار بار کہہ رہی
تھی "میرا دم گھٹ رہا ہے امی، میرے گلے میں کچھ پھنس رہا
ہے امی..... میں مرجاؤں گی امی!"

اور اب وہ بستر پر ڈھے گئی تھی۔ بس کبھی کبھی اس کے
ہونٹوں سے مدھم کراہ نکلتی تھی۔ گاؤں کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔
اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ ہے اور
اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ بالکل کسی پرندے
کی طرح..... کسی فاختہ کی طرح۔ یہ ہارٹ اٹیک کی سی کیفیت
تھی لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ ذہن
پر غیر معمولی دباؤ کے سبب ایسا ہو۔ اس نے راحت کی والدہ
سے پوچھا "کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے تذبذب کے عالم
میں راحت کو دو انجکشن لگائے اور زبان کے نیچے رکھنے والی
گولی بھی دے دی۔ اسے امید تھی کہ دلہن کی حالت جلد ہی
سنبھل جائے گی۔ یہ شادی کا موقع تھا اور شادی بھی ایسی جسے
انجام تک پہنچانے کے لیے جاگیردار صاحب سخت بے چین
نظر آ رہے تھے۔ وہ اس شادی کا پروگرام درہم برہم کرنا نہیں
چاہتا تھا۔

نکاح کے وقت تک دلہن کی حالت کچھ سنبھل گئی لیکن
اتنی بھی نہیں سنبھلی کہ وہ خود سے بیٹھ سکتی۔ اسے سہارا دے
کر بٹھایا گیا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں اس سے "مرضی"
پوچھی گئی۔ وہ خاموش رہی۔ حسب رواج اس خاموشی کو
رضامندی قرار دیا گیا "مبارک..... مبارک" کی دو تین
صدائیں بلند ہوئیں اور راحت پرائی ہو گئی..... آخر رخصتی کا
وقت آن پہنچا۔ اہل خانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔
سہیلیوں نے راحت کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے قدم
لڑکھڑا رہے تھے۔ کسی وقت تو ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے سے
انکار کر دیتی تھیں۔ فاصلہ کافی تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ڈولی اندر لائی
جائے۔ ڈولی اندر لائی گئی۔ دلہن کے چچا نے روتے روتے
دلہن کو گود میں اٹھا لیا اور ڈولی کے اندر گاؤ تکیے کے سہارے
نیم دراز کر دیا۔ سسکیوں اور آہوں کی سرسراہٹ میں ڈولی
روانہ ہو گئی۔ بالکل جیسے قاسم کا اسٹریچر روانہ ہوا تھا۔

..... رات کو مولا بخش عرف مولی نے دلہن کو سیج پر دیکھا۔
وہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھی۔ مولی کی والدہ اور بڑی
بہن نے کہا تھا کہ دلہن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس نے سوچا،
اچھی بھلی تو ہے، بیمار کوئی ایسے ہوتے ہیں۔

وہ چہرے کے بناؤ سنگھار کے نیچے موت کی زردی نہیں
دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ شراب کا ہلکا سا خمار
اس کے دماغ کو ہوا میں اڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ
دلہن کا مہندی لگا ہاتھ عجیب سے انداز میں ایک طرف
ڈھلک گیا ہے۔ اس نے دلہن کا شانہ جھنجوڑا "راحتے.....
راحتے! آنکھیں کھول۔"

لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ مر چکی تھی اور
یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ شکرے کی دہشت سے
فاختہ مر بھی جایا کرتی ہے..... اس کا ننھا سا جگر پھٹ بھی جایا
کرتا ہے۔

..... جس وقت سرگودھا میں قاسم کا جنازہ اٹھ رہا تھا، اس
وقت باغ پور میں راحت کی میت کے سرہانے اس کی ماں اور
باپ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ دونوں "مجرم" آزاد
ہو چکے تھے۔